نظریاتی صحافت کا سرخیل

الطاف حسن قریشی صاحب سے میری دو ملاقاتیں ہوئیں۔ صاحب فراش تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ذہنی طور پر چاک و چوبند۔ انہیں حد درجہ سادہ زندگی گزارنے کا عادی پایا۔ پھر ہوا یہ کہ وہ ہفتے میں ایک دو بار ضرور فون کرتے۔ اس طرح تعلق کا یہ سلسلہ قدرے مضبوط ہو گیا۔ ان کی وفات کو تھوڑا سا عرصہ گزر چکا ہے۔ آج ان کے متعلق یہ کتاب' پڑھ رہا تھا۔ تو پوری شخصیت تصویر بن کر سامنے آ گئی۔ علامہ عاصم نے الطاف صاحب کے متعلق کتاب لکھ کر قومی فریضہ انجام دیا ہے۔ ویسے بذات خود علامہ صاحب' مرنجان مرنج قسم کے انسان ہیں۔ قریشی صاحب سے میرا ذاتی تعارف انہیں کی وساطت سے ہوا تھا۔ آج' اس کتاب پر گزارشات پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر فرید احمد پراچہ ایک اجلے انسان ہیں۔ جماعت اسلامی سے ان کی وابستگی حد درجہ گہری ہے۔ ذاتی طور پر میں نے انہیں بہت اعلیٰ انسان پایا ہے۔ وہ قریشی صاحب کی کتاب ''پیارے مولانا'' میں رقم دراز ہیں: یہ حقیقت ہے کہ الطاف حسن قریشی کے شاہکار قلم نے انٹرویو کو محض سوالات و جوابات کی خشک تنگنائیوں سے نکال کر اتنا پرکشش بنا دیا ہے کہ اس میں افسانے کی لذت اور حدیث ماتم دلبری اور حکایت غم آرزو کی کشش پیدا ہو گئی ہے اور انٹرویو بجائے خود ادب کی ایک نئی صنف بن گیا ہے۔ اس کتاب میں بھی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا زندہ جاوید انٹرویو شامل ہے۔ یہ انٹرویو نومبر 1962ء میں لیا گیا۔ انٹرویو کی ابتداء میں الطاف حسن قریشی نے ذکر اس محبت کا کیا ہے کہ جب سید مودودی کو قادیانی مسئلہ کتاب لکھنے کے جرم میں فوجی عدالت سے سزائے موت سنائی گئی اور یہی وہ لمحات تھے جب الطاف حسن قریشی کے لئے مولانا' پیارے مولانا بن گئے۔ ''سزائے موت'' لفظ سنتے ہی جسم میں تھرتھری پیدا ہو جاتی ہے۔ سننے والے بھی کانپنے لگتے ہیں۔ جیل کے قیدیوں میں یہ روایت مشہور ہے'' کہ 302 درخت پر ڈال دی جائے تو درخت سوکھ جاتا ہے۔ یہاں سید مودودی کا کردار سامنے آیا کہ جب سزا سنانے والے فوجی افسر نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو رحم کی اپیل کر سکتے ہیں۔ تو سید مودودی نے بلا تامل جواب دیا کہ مجھے ظالموں سے رحم کی کوئی اپیل نہیں کرنی' زندگی اور موت کے فیصلے زمینوں پر نہیں آسمانوں پر ہوتے ہیں۔ اگر میری موت کا وقت آ گیا ہے تو یہ شہادت کی موت ہے میں اس رتبہ پر اللہ کا شکر ادا کروں گا اور اگر میرا وقت نہیں آیا تو کوئی بھی مجھے نہیں لٹکا سکتا۔

الطاف حسن قریشی کی خوشبو: محترم دلاور چوہدری لکھتے ہیں۔ وہ اپنی کسی کتاب کا تعارف ''نوائے وقت'' میں شائع کرانا چاہتے تھے۔ وہ تعارف تو شائع ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ان کا اور میرا تعارف ایسا گہرا ہو گیا کہ'' سلسلہ ٹوٹا ہی نہیں'' محبت'' کی زنجیر کا پھر وہ دن بھی آ گیا جب پنجاب یونیورسٹی کے'' شعبہ صحافت'' میں ان کی کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ انہوں نے مجھ ناچیز کو فون کیا اور شمولیت اختیار کرنے کر کے چند جملے بولنے کے لئے بھی کہا۔ انتہائی میٹھی طبیعت کے مالک' مشہور شاعر اور ہمارے دوست پی ٹی وی کرنٹ افیئر کے انچارج افتخار مجاز اس تقریب کے سٹیج سیکرٹری تھے۔ انہوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ میرا نام پکارا۔ معلوم نہیں کہاں سے توانائی عود کر آئی اور میں روانی میں بہت سی باتیں کر گیا مجھ سے قبل الطاف صاحب کے پوتے اور ان کی تحریروں کی ترتیب میں معاونت کرنے والے نوجوان'' ایقان'' بات کر چکے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ'' میرے کالج کے دوست اکثر مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تمہارے دادا کون ہیں تم بتاتے ہو وہ بہت بڑے اخبار نویس ہیں لیکن ہم ان کا نام نہیں جانتے''۔

پاکستان ہم سب کا ہے: اس تحریر میں قریشی صاحب کیا خوب لکھتے ہیں۔ آج ہم جو سیاسی منظر نامہ دیکھ رہے ہیں' اس میں مختلف جماعتیں اور ادارے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ پاکستان صرف ان کا وطن ہے' اس پر حکومت کرنے اور اس کے وسائل سے مستفید ہونے کے وہی حقدار ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے دعووں اور بیانیوں میں اس قدر شدت پیدا ہوتی جا رہی ہے کہ معاشرہ بری طرح تقسیم ہو گیا ہے اور گھر گھر ایک جنگ جاری ہے۔ یہ جنگ کس قدر تباہ کن ہے' اس کے آثار زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں اور ارباب فکر و دانش کے لئے گہری تشویش کا باعث بن گئے ہیں۔ ایک جماعت کے شہ نشین کھلے بندوں کہہ رہے ہیں کہ ہمارے سوا باقی تمام لوگ چور اور ڈاکو ہیں جو بیش بہا ملکی وسائل ہڑپ کر چکے ہیں' اس لئے ان کے وجود کا خاتمہ وطن کے مفاد میں ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی ہے کہ ایک شخص اپنی ذات میں انتقام کا ایک سرچشمہ ہے اور جب تک اس کا سیاسی وجود ختم نہیں ہوتا' ملک میں سیاسی اور معاشی استحکام نہیں آ سکتا۔ محاذ آرائی اور پست ترین دھینگا مشتی ایک ایسی خوفناک صورت اختیار کرتی جا رہی ہے کہ دکھوں کا مارا اور سیاست سے لاتعلق شہری الامان الحفیظ پکار اٹھا ہے۔ اور ہر طرف سے یہ صدا سنائی دے رہی ہے کہ اللہ کے لئے سر جوڑ کر بیٹھو' اپنے دل صاف کرو اور ان ہولناک مسائل کا حل تلاش کرو جن سے پاکستان کے وجود کو سنگین خطرات لاحق ہیں۔

بس یہی داستان ہماری ہے: ایک ایسی ہی رات مجھ پر 1967ء میں بھی گزری تھی۔ میں اردو ادب کے عظیم افسانہ نگار اور دانش ور جناب قدرت اللہ شہاب کا انٹرویو لینے شام ڈھلے ان کی اقامت گاہ پہنچا جو اس وقت سیٹلائٹ ٹاؤن' راولپنڈی میں واقع تھی۔ ہم دونوں عشائیہ تناول کر کے آمنے سامنے بیٹھ گئے اور سوال و جواب کا نہایت پرلطف سلسلہ شروع ہو گیا۔ شہاب صاحب بات سے بات نکالتے اور حیران کن واقعات کی قوس قزح بناتے رہتے۔ ماحول کی شگفتگی میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ پھر صبح کی اذانیں نغمہ ریز ہوئیں' تو شہاب صاحب چونک پڑے کہ آج صبح فیلڈ مارشل ایوب خان سے ان کی ملاقات طے تھی' چنانچہ میں نے ان سے رخصت چاہی۔ تمام راستے مجھے شہاب صاحب کے چلبلے جملے یاد آتے رہے۔ آج کی رات بھی بس یہی داستان ہماری ہے پڑھتے پڑھتے صبح کی اذانیں ہو گئیں۔ اور میں اس وقت سے اپنی خوش یقینی سے سرشار ہوں کہ شہاب نامے کی طرح یہ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

رسول بخش رائیس' قریشی صاحب کے متعلق رقم دراز ہیں: میری دوسری بالمشافہ ملاقات 1986ء میں ہوئی جب انہوں نے پاکستان انسٹیٹیوٹ آف نیشنل افیئرز کی بنیاد رکھی۔ اس کی افتتاحی تقریب میں اس درویش کو بھی دعوت علی اور بعد کے سالوں میں وقتاً فوقتاً اس ادارے میں مختلف موضوعات پر اکابرین کو سننے اور اپنی بات کہنے کا موقع ملتا رہا۔ ان میں آخری عمر تک ایک کبھی نہ تھمنے والی تڑپ محسوس کی جو ملک اور معاشرے کی اصلاح' ترقی' خوشحالی اور استحکام کے لئے تھی۔ عام دانشوروں اور ان میں فرق یہ دیکھا کہ وہ ملک کے لئے جو بہتر خیال کرتے اس کے لئے خود پہل کاری کرتے اور دوستوں اور احباب پر زور دیتے کہ کچھ کریں۔ ایک مرتبہ وہ قائداعظم یونیورسٹی تشریف لائے۔ غالباً یہ 1980ء کی دہائی کے اوائل کے ساتھ تھے۔ ایک مورخ ہمکار دوست کے پاس تشریف لائے تھے۔ آمد کا سنا تو ان کی کشش ہمیں بھی کھینچ لے گئی۔ بار بار وہ کہتے رہے کہ اردو انگریزی میں پاکستان کی تاریخ کے بارے مختصر مگر جامع کتاب تحریر کریں۔ عالم فاضل لوگ تو بڑی بڑی کتابیں پڑھتے ہوں گے ہمیں ایسی تاریخ نویسی کی ضرورت ہے جو عام آدمی کی ذہنی دسترس میں آ سکے' دلچسپ ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں مقبول ہو جائے۔ ایک کتاب کیا کئی کتابیں جو اپنی معاشرت' روایات اور تہذیب کے سب رنگ نوجوان نسل کے لئے متاثر کن انداز میں پیش کریں۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوئی یہی جذبہ اور تحریک دیکھی' گاہے گاہے وہ اپنے اس احساس کو سامنے بیٹھے دوستوں کے دلوں میں شفقت سے اتار دیتے۔

ڈاکٹر فاروق عادل کی تحریر' آبلہ پا سے کالم کا اختتام کرتا ہوں۔ ان کی زندگی کے آخری حصے میں صحافت کا انداز بدل چکا تھا۔ ان کے قوی بھی پرانے زمانے کی مہم جو صحافت کے لئے سازگار نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے قلم رکھا نہیں' کالم نگاری شروع کر دی۔ ان کی کالم نگاری بھی ان کے پرچوں کی طرح ایک مقصد کے تحت تھی۔ انہوں نے بہت تھوڑے عرصے میں ملک کی متبادل تاریخ لکھ ڈالی۔ ان کے کالموں سے کئی کتابیں وجود میں آئیں جن کی وجہ ہماری قومی تاریخ کے متبادل بیانیہ میسر آیا۔ اس ضمن میں'' میں نے آئین بنتے دیکھا'' نامی میرے دل کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ یہ محض ایک کتاب نہ تھی۔ کتابی سلسلہ تھا جس کی ابھی تک پہلی جلد ہی شائع ہو سکی ہے۔ پہلی جلد میں انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے کا ماجرا بیان کیا ہے۔ یہ کتاب اس تمام پروپیگنڈے کا حقائق اور تحقیق کی روشنی میں جواب ہے۔ جو آج بھی بعض لوگ پاکستان کے وجود پر کرتے ہیں۔ قریشی صاحب قلم کے دھنی تھے۔ تاریخ انہیں ایک ایسے صاحب قلم کے طور پر یاد رکھے گی جس نے زندگی کی آخری سانس تک قلم ہاتھ سے نہیں رکھا اور جنوں کی حکایات قلم بند کرتا رہا لیکن کسر نفسی دیکھیے کہ اتنی خدمت کرنے کے باوجود سمجھتے تھے کہ میں نے ابھی کیا ہی کیا ہے؟